چو بند نگران موجود ہوتا ہے۔''

گویا انسان کی گفتگو کا ریکارڈ ہی اُس کا نامۂ اعمال ہے۔

تاریخ اسلامی میں ایک مسلمان خاتون کا عجیب قصہ ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حج کو جا رہے تھے۔ راستہ میں انہیں ایک عرب خاتون ملی جو اکیلی بیٹھی تھی۔ پوچھا: آپ یہاں کیسے بیٹھی ہیں؟ وہ کہنے لگی: فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (جس کو اللہ راہ سے بچلا دے اس کی راہنمائی کون کرسکتا ہے؟) انہوں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے۔ کہنے لگی: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (اور لوگوں پر اللہ کی خاطر خانہ کعبہ کا حج فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں)۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ خاتون قافلے سے بچھڑ گئی ہے اور حج کے لیے مکہ مکرمہ جا رہی ہے۔ کہنے لگے آپ کب سے یہاں ہیں؟ اُس نے جواب دیا: ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (برابر تین راتیں)۔ آپ نے پوچھا: آپ کھانا کھائیں گی؟ کہنے لگی: اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (روزے کو رات تک پورا کرو)۔ آپ نے کہا: خاتون! سفر میں تو روزہ معاف ہوتا ہے۔ کہنے لگی: مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (جو شخص دل کی آمادگی کے ساتھ بھلائی کرے تو اللہ قدردان اور جاننے والا ہے)۔ غرض امام صاحب جو بھی بات پوچھتے وہ اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت پڑھ کر اپنا مدعا بیان کر دیتی۔ آپ نے اس کو بھی قافلے کے ساتھ لے لیا اور مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر اس خاتون کے بیٹوں سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہ آپ کی والدہ سے جو بھی بات میں نے پوچھی ہے اُس نے جواب میں قرآن کی آیت پڑھ کر اپنا مطلب واضح کیا ہے' ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے کہا ہماری والدہ حافظہ ہے۔ ایک دفعہ ایک واعظ نے اپنے پرتاثیر وعظ میں زبان کی غلط گفتاری کے سنگین نتائج پر بات کی' اُس دن کے بعد عرصہ ہوا کہ انہوں نے اپنی زبان سے آیات قرآنی کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے یہ ہمیشہ قرآن کی آیت پڑھتی ہیں۔ مثلاً کھانا طلب کرنا ہو تو فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہہ دیتی ہیں اور ہم ان کے سامنے کھانا رکھ دیتے ہیں۔ گویا ان کا نامہ اعمال جو تیار ہو رہا ہے اُس میں قرآنی آیات کے سوا اور کوئی بات نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک اُس عورت کے اس طرزِ عمل اور اس قدر ثابت قدمی' احتیاط اور تقویٰ پر بہت متعجب ہوئے۔

زیر درس حدیث کے الفاظ ہمیں سبق دیتے ہیں کہ زبان کے استعمال میں حتی الوسع احتیاط کی جائے' کیونکہ اس کا غلط استعمال نتیجے کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔ جبکہ اس کا محتاط استعمال دین اور دنیا کی بھلائیوں کا باعث ہے۔OO

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

حقیقت و مجازِ قرآن

حافظ محمد زبیر ☆

یہ مضمون امام سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان'' اور علامہ زرکشیؒ کی کتاب ''البرہان'' سے ماخوذ ہے۔

© rasailojaraid.com

قرآن میں مجاز

اس بارے میں علماء میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ قرآن میں حقیقت کا استعمال ہوا ہے اور حقیقت کی تعریف یہ ہے:

وھی کل لفظ بقی علی موضوعه و لا تقدیم فیه و لا تاخیر

''ہر وہ لفظ جو کہ اپنے اس (بنیادی) معنیٰ میں باقی رہے جس کے لیے وہ وضع ہوا ہے اور اس میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ ہو''۔

روز مرہ زندگی میں اکثر کلام حقیقت پر مشتمل ہوتا ہے۔ جہاں تک مجاز کا معاملہ ہے تو جمہور علماء قرآن میں مجاز کے وقوع کے قائل ہیں، اگرچہ بعض علماء نے قرآن میں مجاز کا انکار کیا ہے، مثلاً 'اہل ظواہر' شوافع میں 'ابن القاص' اور مالکیہ میں 'ابن خویز منداد' قرآن میں مجاز کے قائل نہیں ہیں۔ ان علماء کا اعتراض یہ ہے کہ مجاز جھوٹ کی ایک قسم ہے اور قرآن جھوٹ سے منزہ ہے۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ متکلم مجاز کو اس وقت اختیار کرتا ہے جب اس کے لیے حقیقت کا دائرہ تنگ ہو جائے اور اللہ کے لیے یہ محال ہے کہ اس پر حقیقت کا دائرہ تنگ ہو۔ لیکن ان حضرات کا یہ شبہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ اگر قرآن میں مجاز نہ رہے تو اس کی ایک بہت بڑی خوبی باقی نہ رہے گی، کیونکہ علم بلاغت کے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام میں حقیقت کی نسبت مجاز کے استعمال میں زیادہ خوبی ہے اور اگر قرآن کو مجاز سے خالی مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قرآن توکید، حذف اور تصریف قصص سے بھی خالی ہے۔ امام

☆ ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

© rasailojaraid.com

عز بن عبد السلامؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور امام سیوطیؒ نے اس کتاب کا خلاصہ بہت سے اضافوں کے ساتھ ایک علیحدہ کتاب میں بیان کر دیا ہے' جس کا نام انہوں نے 'مجاز الفرسان الی مجاز القرآن' رکھا ہے۔

مجاز کی اقسام:

مجاز کی دو قسمیں ہیں: مجاز فی الترکیب اور مجاز فی المفرد۔

پہلی قسم:

پہلی قسم مجاز فی الترکیب ہے' اسے مجاز الاسناد اور مجازِ عقلی بھی کہتے ہیں' اس میں علاقہ مشابہت کا ہوتا ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے:

ان یسند الفعل أو شبهه الی غیر ما هو له أصالة لملابسته له

''فعل یا شبہ فعل کی نسبت اس امر کی طرف کی جائے جس کے لیے وہ بنیادی طور پر وضع نہیں ہوا' اس لیے کہ اس فعل یا شبہ فعل کی اس امر کے ساتھ کوئی مشابہت ہو''۔

اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا درج ذیل قول ہے:

﴿وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا﴾ (الانفال:٢)

''اور جب ان پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (آیات) ان (اہل ایمان) کو بڑھا دیتی ہیں از روئے ایمان کے''۔

اس آیت مبارکہ میں ایمان بڑھانا جو کہ اللہ کا فعل ہے اس کی نسبت آیات کی طرف مجازاً کی گئی ہے' کیونکہ آیات زیادتی ایمان کا سبب ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (القصص:٤)

''وہ (فرعون) ان (بنی اسرائیل) کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا''۔

حالانکہ ذبح کرنے والے فرعون کے اعوان و انصار تھے' لیکن ذبح کی نسبت فرعون کی طرف مجازاً کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا﴾ (المؤمن:٣٦)

''اور فرعون کہنے لگا اے ہامان تو میرے لیے ایک محل بنا''۔

حالانکہ محل بنانے والے ہامان کے کارندے تھے لیکن مجازاً اس کی نسبت ہامان کی طرف کی گئی ہے۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

©rasailojaraid.com

﴿وَاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ﴾ (ابرٰھیم)

''اور وہ (یعنی قومِ فرعون کے سردار) اپنی قوم کو تباہی کے گھر (یعنی جہنم) پر اُتاریں گے''۔

حالانکہ جہنم میں قومِ فرعون کو داخل کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' لیکن یہاں اس فعل کی نسبت قومِ فرعون کے سرداروں کی طرف مجازاً کی گئی ہے' کیونکہ وہ اپنی قوم کے جہنم میں جانے کا سبب ہوں گے۔ ایک جگہ قیامت کے دن کی ہولناکی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبًا﴾ (المزمّل)

''وہ دن جو کہ بچوں کو بوڑھا کر دے گا''۔

اس آیت مبارکہ میں فعل کی نسبت مجازاً دن کی طرف کی گئی' کیونکہ اُس دن میں یہ فعل واقع ہو گا۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا﴾ (الزلزال)

''اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی''۔

اس آیت میں فعل اخراج کی نسبت زمین کی طرف کی گئی ہے حالانکہ یہ اللہ کا فعل ہے۔ اور یہ نسبت مجازاً ہے۔

دوسری قسم:

مجاز کی دوسری قسم مجاز فی المفرد ہے' اسے مجاز لغوی بھی کہتے ہیں۔ اس میں علاقہ مشابہت کا نہیں ہوتا۔ اس کی تعریف یہ ہے:

استعمال اللفظ فی غیر ما وضع له أولا

''کسی لفظ کو اس معنی میں استعمال کرنا جس کے لیے وہ ابتداءً وضع نہ ہوا ہو''۔

اس کی مزید کئی اقسام ہیں:

① **حذف**: یعنی کلام میں کچھ حذف کر دینا۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿قَالُوۡا سَلٰمًا﴾ (الفرقان)

''وہ کہتے ہیں (ہم) سلام (کہتے ہیں)''۔

''سَلٰمًا'' مفعول مطلق ہے اور اس کا فعل ''سَلَّمۡنَا'' محذوف ہے۔ اور تقدیر عبارت یوں ہوگی: ''قالوا سلمنا سلاما''۔

© rasailojaraid.com

اسی طرح کلام میں عموماً مضاف کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ﴾ (یوسف:۸۲)

''اور تو سوال کر بستی (والوں) سے''۔

اس آیت میں 'قریة' سے مراد 'اھل قریة' ہیں' کیونکہ 'قریة' سے سوال نہیں ہوتا' اس لیے یہاں 'اھل' محذوف ہے۔ اسی طرح حواریین مسیحؑ کے الفاظ یوں نقل کیے گئے ہیں:

﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ (الصف:۱۴)

''ہم اللہ کے (دین) کے مددگار ہیں''۔

یہاں مراد 'نَحْنُ اَنْصَارُ دِيْنِ اللّٰهِ' ہے۔ 'دین' یہاں محذوف ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

© rasailojaraid.com

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ (البقرۃ:۹۳)

''اور وہ پلائے گئے اپنے دلوں میں بچھڑے (کی محبت)''۔

یہاں پر 'حب' محذوف ہے اور مراد 'حُبَّ العِجل' ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ﴾ (الاعراف:۱۵۵)

'اور حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم (میں سے کچھ) کو چن لیا'۔

یہاں پر 'مِن' محذوف ہے اور مراد 'مِنْ قَوْمِهٖ' ہے۔

علامہ زرکشی نے لکھا ہے کہ محققین علماء حذفِ مضاف کو مجاز کی اقسام میں شمار نہیں کرتے' کیونکہ اس کا استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے جس کے لیے یہ وضع کیا گیا ہوتا ہے۔

(۲) زیادتی: اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں بعض نحویوں کے نزدیک 'مثل' زائدہ ہے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی: 'لیس کھو شیء'۔ جبکہ معروف موقف یہ ہے کہ 'کاف' زائدہ ہے اور 'مثل' لیس کی خبر ہے اور تقدیر عبارت یہ ہوگی 'لیس مثله شیء'۔ کیونکہ اسم (یعنی مثل) کو زائد کہنے سے بہتر ہے کہ حرف (یعنی کاف) کو زائد کہا جائے۔ یہ قول ابن جنی اور ابوسعید السیر افی وغیرہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور 'حرف

© rasailojaraid.com

کاف' یہاں زائدہ ہے' اگر ہم اس کو زائدہ نہ مانیں تو کلام محال ہو جائے گا' کیونکہ اگر 'حرف کاف' کو زائدہ نہ مانا جائے تو یہ 'مثل' کے معنی میں ہوگا اور تقدیر عبارت ہوگی 'لیس مثل مثله شيء'۔ اگر ہم اس تقدیر عبارت کو مان لیں تو اللہ کے لیے 'مثل' کا اثبات ہوگا اور نفی اس بات کی ہوگی کہ اس کی مثل کے مشابہ کوئی نہیں ہے' یعنی مثل سے مشابہت کی نفی ہوئی نہ کہ اللہ کی ذات سے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں کچھ بھی زائد نہیں ہے کیونکہ یا تو یہاں 'مثل' صفت کے معنی میں ہے اور تقدیر عبارت ہے 'لَيْسَ كَصِفَتِهٖ شَيْءٌ' یا پھر 'مثل' سے مراد مثل ہی ہے' کیونکہ معدوم سے بھی کسی چیز کی نفی کرنا جائز ہے' اس لیے اللہ کا 'مثل' معدوم ہے اور اس (مثل معدوم) کے مثل کی نفی کی جا رہی ہے۔

③ کل کا اطلاق جزء پر ہو: یعنی کل بول کر مراد اس کا جزء ہو۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ﴾ (البقرة:١٩)

''وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں''۔

اس آیت میں 'اَصَابِع' یعنی انگلیوں سے مراد ان کا جزء یعنی انگلیوں کے پور ہیں۔ کیونکہ انسان کی انگلی اس کے کان میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ﴾ (البقرة:١٨٥)

''پس جو بھی تم میں سے (رمضان کے) مہینے میں حاضر ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس (مہینے) کا روزہ رکھے''۔

اس آیت مبارکہ میں مہینے کا روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اور مہینے میں دن اور رات دونوں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں مراد مہینے کا جزء یعنی صرف دن ہے۔

④ جزء کا اطلاق کُل پر ہو: یعنی جزء بول کے مراد اس کا کل ہو۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ (البقرة:١٤٤)

''پس آپ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں''۔

اس آیت مبارکہ میں 'وَجه' سے مراد پورا جسم ہے۔

اسی طرح ﴿قُمِ الَّيْلَ﴾ (المزمل:٢) اور ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ (البقرة)' اور ﴿مِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ﴾ (الدهر:٢٦) میں قیام' رکوع اور سجود سے مراد نماز ہے' ان آیات

© rasailojaraid.

میں نماز کا جزء بول کر مراد نماز لی گئی ہے۔اسی طرح ﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ (المائدۃ:۹۵) میں 'الْكَعْبَةِ' سے مراد حرم ہے' کیونکہ قربانیاں کعبہ میں تو ذبح نہیں ہوتیں۔

بعض اوقات لفظ 'بَعْض' بول کر کل مراد لیا جاتا ہے یہ بھی اس میں شامل ہے مثلاً:

﴿وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ج﴾ (الزخرف:۶۳)

بعض نے ذات کی صفت سے اس کے بعض حصے کو متصف کرنا اور بعض کی صفت سے کل کی توصیف کو بھی ان دو اقسام میں شامل کیا ہے۔ پہلے کی مثال ﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶)﴾ (العلق) ہے کیونکہ خطأ کل کی صفت ہے' یہاں بعض (یعنی نَاصِيَة) کی بیان ہوئی ہے۔اسی طرح دوسرے کی مثال ﴿اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ (۵۲)﴾ (الحجر) اور ﴿وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸)﴾ (الکہف) ہے۔ 'وجل' اور 'رعب' قلب کی صفات ہیں جبکہ ان کی نسبت مجسم انسان کی طرف کی گئی ہے۔

⑤ اسم خاص کا اطلاق عام پر: یعنی خاص بول کر مراد عام ہو' اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)﴾ (الشعراء)

''بے شک ہم تمام جہانوں کے رب کے رسول ہیں''۔

⑥ اسم عام کا اطلاق خاص پر: یعنی عام بول کر مراد خاص ہو۔اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ط﴾ (الشوریٰ:۵)

''اور وہ (فرشتے) بخشش طلب کرتے ہیں اس کے لیے جو زمین میں ہے''۔

اس آیت میں 'مَنْ فِي الْاَرْضِ' عام ہے' لیکن اس سے مراد خاص یعنی صرف مؤمنین ہیں' کفار اس میں داخل نہیں ہیں' جیسا کہ ایک دوسری آیت میں وضاحت ہے ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج﴾ (المؤمن:۷) اسی طرح ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۲۲۴)﴾ (الشعراء) میں تمام شعراء مراد نہیں ہیں۔اسی طرح ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط﴾ (الحجرات:۱۴) میں کچھ بدو مراد ہیں۔اسی طرح ﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ط﴾ (الانعام:۶۶) میں بعض قوم مراد ہے۔اسی طرح ﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۶۳)﴾ (الانعام) میں پہلے مسلمان داخل نہیں ہیں۔ چونکہ اللہ کے رسول ﷺ سے پہلے بہت سے مسلمان انبیاء گزرے ہیں' اس لیے یہاں اللہ کے رسول ﷺ کی مراد ہے کہ اپنی قوم میں' میں پہلا مسلمان ہوں۔اسی طرح ﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ (آل عمران:۱۷۳) میں 'اَلنَّاس' عام نہیں ہے بلکہ

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

خاص ہے۔اسی طرح ﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا﴾(الاحقاف:۲۵) میں ’كُلَّ شَيْءٍ‘ عام نہیں بلکہ خاص ہے‘یعنی جس کے تباہ ہونے کا ارادہ اللہ نے کرلیا تھا اس کو تباہ کرتی تھی۔اسی طرح ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج﴾(البقرۃ:۱۹۷) میں ’اَشْهُرٌ‘ سے مراد دو مہینے اور کچھ دن زائد ہیں‘یعنی پورے تین مہینے نہیں ہیں‘ جبکہ عربی زبان میں ’اَشْهُرٌ‘ کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے۔

⑦ملزوم کا اطلاق لازم پر: یعنی ملزوم بول کر مراد لازم ہو۔اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ﴾ (الروم:۳۵)

’’یا ہم نے ان پر کوئی واضح دلیل اتاری ہے پس وہ کلام کرتی ہو‘‘۔

اس آیت مبارکہ میں ’سُلْطَان‘ یعنی دلیل کی طرف کلام کرنے کے فعل کی نسبت کی گئی ہے لیکن ’يَتَكَلَّمُ‘ اس آیت میں ’يَدُلُّ‘ یعنی رہنمائی کرنا کے معنی میں ہے۔رہنمائی کرنا لازم ہے اور کلام کرنا اس کا ملزوم ہے‘ اس لیے یہاں لازم کی جگہ ملزوم کو مجازاً لایا گیا ہے۔

⑧لازم کا اطلاق ملزوم پر: یعنی لازم بول کر مراد ملزوم ہو۔اس کی مثال امام زرکشی نے یہ بیان کی ہے:

﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ط﴾ (المائدۃ:۱۱۲)

’’کیا آپ کا ربّ ہمارے اوپر آسمان سے کھانا نازل کرے گا‘‘۔

یہاں استطاعت کا اطلاق فعل پر ہے‘یعنی ’يَسْتَطِيْعُ‘ سے مراد ’يَفْعَلُ‘ ہے‘ کیونکہ کسی فعل کے لیے استطاعت کا ہونا لازم ہے‘اس لیے استطاعت لازم اور فعل ملزوم ہے اور یہاں لازم بول کر مراد ملزوم ہے۔کیونکہ اللہ تو ہر چیز کی استطاعت رکھتا ہے اور اس کے بارے میں یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ وہ کسی چیز کی استطاعت رکھتا ہے یا نہیں؟

⑨مسبب کا اطلاق سبب پر: یعنی مسبب بول کر مراد سبب ہو۔اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ط﴾ (المؤمن:۱۳)

’’وہ تمہارے لیے آسمان سے رزق نازل کرتا ہے‘‘۔

اس آیت میں ’رِزْق‘ جو کہ مسبب ہے اس سے مراد بارش ہے جو کہ اس کا سبب ہے‘ کیونکہ آسمان سے تو رزق نازل نہیں ہوتا‘ رزق تو زمین سے نکلتا ہے‘ لیکن اس رزق کا سبب بارش ہے جو کہ آسمان سے نازل ہوتی ہے۔اسی طرح ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا﴾(الاعراف:۲۶)

© rasailojaraid

میں 'لِبَاس' سے مراد اس کا سبب یعنی بارش ہے ۔اسی طرح ﴿لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ (النور:۳۳) میں 'نکاح' سے مراد اس کے اسباب ہیں' جیسے حق مہر وغیرہ

⑩ سبب کا اطلاق مسبب پر: یعنی سبب بول کر مراد مسبب ہو۔اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ﴾ (ھود:۲۰)

''وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے''۔

اس آیت میں سننے سے مراد قبول کرنا ہے۔چونکہ سننا قبول کرنے کا سبب ہے اس لیے سبب یعنی سننا بول کر مراد مسبب یعنی قبول کرنا لیا گیا ہے ۔اسی طرح ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) میں بھی دوسری 'سَيِّئَةٌ' سے مراد جزاء ہے' کیونکہ 'سَيِّئَةٌ' سبب ہے اور 'جَزَاء' اس کا مسبب ہے۔

سبب کے سبب کی طرف فعل کی نسبت بھی اس میں داخل ہے' مثلاً قرآن میں ہے: ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ (البقرۃ:۳۶) اس آیت میں حضرت آدم وحوا علیہما الصلاۃ و السلام کو جنت سے نکالنے کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے' حالانکہ دونوں کو جنت سے اللہ تعالیٰ نے نکالا تھا۔چونکہ اللہ کے اس نکالنے کا سبب پھل کھانا تھا اور پھل کھانے کا سبب شیطان تھا' اس لیے نکالنے کی نسبت سبب کے سبب یعنی شیطان کی طرف کر دی گئی۔

⑪ اعتبار ما کان: یعنی ایک چیز کی ماضی کی کسی حالت کا زمانہ حال میں اطلاق کرنا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ﴾ (النساء:۲)

''اور یتیموں کو ان کے مال دے دو''۔

اس آیت مبارکہ میں یتیموں کو ان کا مال واپس کرنے کا حکم دیا گیا ہے' حالانکہ یتیموں کو ان کا مال اُس وقت واپس کرنے کا حکم ہے جبکہ وہ بالغ ہو جائیں اور بلوغت کے بعد وہ یتیم نہیں رہتے۔ اس لیے یہاں ان بالغ بچوں کو یتیم ان کے ماضی کے اعتبار سے کہا گیا ہے ۔اسی طرح ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ (البقرۃ:۲۳۲) میں 'اَزْوَاج' یعنی شوہر کا لفظ اعتبار ما کان ہے' کیونکہ نکاح تو شوہروں سے نہیں ہوتا' بلکہ مراد سابقہ شوہر ہیں ۔اسی طرح ﴿مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا﴾ (طٰہٰ:۷۴) میں مجرم اعتبار ما کان ہے' یعنی دنیا میں مجرم تھا۔

⑫ اعتبار ما یکون: یعنی ایک شے کی مستقبل میں کسی متوقع حالت کا اطلاق حال پر کر

© rasailojaraid.com

دینا۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿اِنِّیْٓ اَرٰنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ (یوسف:٣٦)

''بے شک میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں''۔

اس آیت میں انگور کی جگہ 'خَمْر' یعنی شراب کا لفظ بولا گیا ہے' کیونکہ انگور اپنے ممکنہ مستقبل کے اعتبار سے شراب ہیں۔ اسی طرح ﴿وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ﴿٢٧﴾﴾ (نوح) میں بھی اعتبار ما یکون ہے' کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اُس وقت وہ کافر اور فاجر نہیں ہوتا' بلکہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کافروں کے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے ان کو کافر اور فاجر کہا گیا ہے۔ اسی طرح ﴿حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ ط﴾ (البقرۃ:٢٣٠) میں 'زَوْج' کا لفظ اعتبار ما یکون ہے' کیونکہ نکاح زوج یعنی شوہر سے نہیں ہوتا بلکہ غیر شوہر سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ﴿١٠١﴾﴾ (الصّٰفّٰت) میں 'حَلِیْم' اعتبار ما یکون کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا ہے' کیونکہ کوئی بھی بچہ پیدا ہوتے ہی اس صفت سے متصف نہیں ہوتا۔

⑬ حال کا اطلاق محل پر: یعنی حال بول کر مراد اس کا محل (جگہ) ہو۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾﴾ (آل عمران)

''پس اللہ کی رحمت میں' وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

اس آیت مبارکہ میں 'رَحْمَة' سے مراد محل رحمت یعنی جنت ہے۔ اسی طرح ﴿بَلْ مَکْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (سبا:٣٣) میں مراد 'فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ' ہے۔ اسی طرح ﴿اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا ط﴾ (الانفال:٤٣) میں حسن بصری کے نزدیک 'مَنَام' سے مرادِ محلِ منام یعنی آنکھ ہے۔

⑭ محل کا اطلاق حال پر: یعنی محل (جگہ) بول کے مراد اس کا حال ہو۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ ﴿١٧﴾﴾ (العلق)

''پس اسے چاہیے کہ وہ اپنی مجلس کو پکارے''۔

اس آیت میں 'نَادِیَه' یعنی محل مجلس سے مراد اہل مجلس ہیں۔ اسی طرح ﴿بِیَدِهِ الْمُلْکُ ز﴾ (الملک:١) میں محلِ قدرت یعنی ہاتھ سے مراد قدرت ہے۔ اسی طرح ﴿یَقُوْلُوْنَ

© rasailojaraid
© rasailojaraid

بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۶۷) میں محل زبان یعنی 'اَفْوَاہ' سے مراد زبان ہے۔ اسی طرح ﴿وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ ﴾(یوسف:۸۲) میں محل یعنی قریہ سے مراد اہل قریہ ہیں۔ اسی طرح ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (الاعراف:۳۱) میں دونوں انواع اکٹھی ہوگئی ہیں' زینت سے مراد محل زینت ہے' جبکہ مسجد یعنی محل نماز سے مراد نماز ہے۔ اسی طرح ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ﴾(الاعراف:۱۷۹) میں محل عقل یعنی قلوب سے مراد عقل ہے۔

⑮ ایک شے کو اس کے آلہ سے موسوم کرنا: اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ (ابراھیم:٤)

''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بھی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان میں''۔

اس آیت مبارکہ میں لغت کو اس کے آلہ یعنی لسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ﴿۸۴﴾﴾ (الشعراء) میں ثنا کو اس کے آلہ یعنی لسان سے تعبیر کیا گیا ہے' اس لیے لسان صدق سے مراد ثنائے صدق ہے۔

⑯ ایک شے کو اس کی ضد سے پکارنا: اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴿۲۱﴾﴾ (آل عمران)

''پس آپ اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں''۔

بشارت کو عذاب کے ساتھ اکٹھا کیا گیا ہے جو کہ اس کی ضد ہے۔ اسی طرح ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ﴾ (الاعراف:۱۲) سے مراد 'مَا دَعَاكَ اَلَّا تَسْجُدَ' ہے' یعنی 'منع' بمعنی 'دعا' ہے۔ اس صورت میں 'لا' زائدہ نہ ہوگا۔

⑰ فعل کی اضافت ایسی شے کی طرف کرنا کہ وہ فعل اس سے سرزد ہونا صحیح نہ ہو مگر تشبیہاً اس کا ذکر ہو۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ﴾ (الکہف:۷۷)

''وہ دیوار گرنا ہی چاہتی تھی''۔

حالانکہ ارادہ جاندار کی صفت ہے لیکن اسے دیوار کے لیے استعمال اس لیے کیا کہ دیوار اتنی جھکی ہوئی تھی گویا وہ از خود گرنے کے لیے تیار بیٹھی ہو' اس لیے اس کے لیے ارادہ کا لفظ تشبیہاً استعمال کیا گیا۔ یا پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ فعل اس میں وقوع پذیر ہوتا ہے' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

© rasailojaraid

﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾﴾ (الروم)

''الٓمّ' روم مغلوب ہو گیا''۔

اس آیت میں مغلوب ہونے کی نسبت 'روم' کی طرف کی گئی ہے' حالانکہ مغلوب ہونے والے اہل روم تھے۔

⑱ **فعل کو بولنا مگر مراد اس کی مشارفت (یعنی فعل کے کرنے کے لیے تیار ہو جانا) یا مقاربت (یعنی فعل کے نزدیک ہونا) ہو۔** اس کی مثال درج ذیل ہے:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ﴾ (الطلاق:۲)

''پس جب وہ اپنی مقررہ مدت کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو روک لو''۔

اس آیت میں 'بلوغ' سے مراد قربِ بلوغ ہے' کیونکہ اجل تک پہنچنے کے بعد تو عورت اپنے خاوند کے نکاح سے نکل جاتی ہے' لہٰذا اسے روکنے کا اختیار خاوند کے پاس باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (الاعراف) میں 'اجل' سے مراد قربِ اجل ہے۔ اسی طرح ﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ﴾ (النساء:۹) میں 'ترک' سے مراد قربِ ترک ہے۔ اسی طرح ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ (المائدۃ:۶) میں 'قیام' سے مراد ارادۂ قیام اور ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (النحل:۹۸) میں 'قراءت' سے مراد ارادۂ قراءت ہے۔ اسی طرح ﴿وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا﴾ (الاعراف:۴) میں 'اهلاك' سے مراد ارادۂ اهلاك اور ﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ﴾ (المائدۃ:۴۲) میں 'حکم' سے مراد ارادۂ حکم ہے۔ اسی طرح ﴿اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ﴾ (المجادلۃ:۱۲) میں 'مناجات' سے مراد ارادۂ مناجات اور ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ﴾ (النساء:۵۸) میں مراد ارادۂ حکم ہے۔ اسی طرح ﴿اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (الطلاق:۱) میں مراد ارادۂ طلاق اور ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾ (الانعام:۱۵۲) میں مراد ارادۂ قول ہے۔ علامہ زمخشری نے ﴿قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا﴾ (ہود:۳۲) میں 'جدال' ارادۂ جدال کے معنی میں لیا ہے تاکہ تکرار سے بچا جا سکے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسی نوع کے تحت ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ج﴾ (الاعراف:۱۷۸) کو بھی داخل کیا ہے۔

⑲ **قلب:** اس کے معنی اُلٹ پھیر کے ہیں۔ اس کی تین اقسام ہیں:

یا تو اسناد کا قلب ہو گا۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

© rasailojaraid.c

© rasailojaraid.c